بانو قدسیہ کے افسانوں میں ما بعد الطبیعیاتی عناصر

ڈاکٹر اقلیمہ ناز

ABSTRACT:
Bano Qudsia is a versatile genius of urdu Literature. She is considered a remarkable literary figure round the globe. There are multiple layers of her intellectual endeavor. Her multifaceted novelty and ingenuity is reflected in different genres including short story, novel, drama and autobiography. Her literary enterprise has hightened her artistic stature among Udru writers. By 2014, 9 out of 31 books of short stories have been published by Bano Qudsia which comprises of different aspects of life like romanticism, mysticism, myths and metaphysical elements. This article covers different metaphysical elements in short stories of Bano Qudsia.

بانو قدسیہ اردو افسانہ نگاروں میں ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہیں ۔محبت ان کے افسانوں کا بنیادی موضوع ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کے افسانوں میں تصوف کی روحانی و باطنی کیفیات کا ذکر پوری توانائی کے ساتھ سامنے آیا ہے یہی متصوفانہ رنگ ان کے افسانوں میں مابعد الطبیعیاتی عناصر پیدا کرتا ہے ۔

بانو قدسیہ اپنے عہد کی ایک با شعور افسانہ نگار ہیں اس لیے وہ اشیاء اور افراد کو محض محسوساتی سطح پر نہیں پرکھتیں بلکہ وہ انسان کی داخلی کیفیات کو ان کی پوری گہرائی کے ساتھ اپنے افسانوں میں سموتی ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں ماورائی نقطۂ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے ماضی پسندی ، فرد کے باطنی کرب اور اس کی روحانی سطح پر مراجعت کو اس جامعیت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ان کا افسانہ مابعد الطبیعیاتی جہات کا حامل ہو گیا ہے ۔ ڈاکٹر محبوب عالم بانو قدسیہ کے افسانوں میں موجود مابعد الطبیعیاتی جہات کی نشاندہی یوں کرتے ہیں ۔ ''بانو قدسیہ کے افسانوں میں فکر و فن کا بہترین امتزاج نظر آتا ہے ۔ ان کے افسانوں میں سماجی و معاشرتی شعور ، بصیرت اور مابعدالطبیعیاتی رنگ ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔''(۱)

بانو قدسیہ انسانی ذات سے وابستہ تمام امور پر گہری نظر رکھتی ہیں ۔ان کے افسانے خارجی کیفیات کی نسبت داخلی کیفیات کے بہترین ترجمان ہیں ۔ اس لیے ان کے افسانوں میں بہت سے رجحانات یکجا ہو کر سامنے آتے ہیں ۔ مابعد الطبیعیات ان کی فکر کا ایک اہم جزو ہے ۔ وہ مابعد الطبیعیاتی عناصر کے ذریعے اگر ایک طرف اپنے افسانوں میں طلسماتی فضا پیدا کرتی ہیں تو دوسری طرف ان کے افسانے فرد کی داخلی کیفیات کے بہترین ترجمان بن جاتے ہیں ۔ وہ اپنے افسانوں میں مافو ق الفطرت باتوں اور قوتوں کی مدد سے بھی مابعد الطبیعیاتی طرزِ احساس کو اجاگر کرتی ہیں ۔ ان کے افسانوں میں

موجود تجسّس اور حیر ت و استعجاب کے عناصر چونکا دینے والی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ یہی تجسّس اور حیرت کی فضاقاری کو افسانہ پڑھنے پر مائل کرتی ہے۔ افسانہ '' کیمیا گر'' میں بانو قدسیہ نے تحیّر کے عناصر پیدا کر کے اس میں مابعد الطبیعیاتی فکر کو ابھارا ہے ۔ اس افسانے کا مرکزی کردار بابا خیرو گنڈے ، تعویز اور جادو کے گُروں سے بخوبی واقف ہے۔ اس کی باتوں اور حرکات و سکنات میں اس قدر پُر اسراریت موجود ہے کہ بازار میں اس کی آمد سے ہلچل شروع ہو جاتی ہے اور دکاندار اپنا کام چھوڑ کر اس کی باتیں پوری توجہ سے سنتے ہیناور پھر اس کی شخصیت سے متعلق طرح طرح کے مفروضے قائم کرتے ہیں۔

وہ تو دوسری طرح کے نسخے بنوانے آتا ہے۔ جادو کے نسخے --- گنڈے ، تعویز کی چیزیں لینے آتا ہے ۔ بابا خیرو --- بابا خیرو تو جادو گر ہے --- بڑے بڑے جن اس کے تابع ہیں۔چاہے تو راتوں رات مولوی صاحب کی چارپائی اٹھوا کر قبرستان پہنچا دے ۔چاہے تو تمہارے قصبے میں آندھی آ جائے۔۲

تحیّر اور اسرار کی یہ فضا دراصل داستانوں کی خصوصیت ہے مگر یہ افسانوں میں بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ ''کیمیا گر '' میں بانو قدسیہ نے با با خیرو کی شخصیت میں موجود پُر اسراریت کو اتنے مؤثر انداز سے پیش کیا ہے کہ قاری محویت کے ساتھ پوری کہانی کو پڑھتا ہے اور اسی محویت کے ساتھ اختتام تک پہنچ جاتا ہے ۔

بابا خیرو نے کوٹھڑی کا پٹ بند کر لیا تو رشید اور فقیر ا نے درز میں جھانکنا شروع کیا۔ اندر اندھیرا تھا اور بابا خیرو بد روح کی طرح ادھر ادھر منڈ لا رہا تھا ۔ پھر طاقچے پر مٹی کا دیا جلا ۔ بابا خیرو نے چٹائی پر بیٹھ کر جیبوں کو ٹٹولنا شروع کیا ۔ آہستہ آہستہ چٹائی پر ننھی ننھی پڑیوں کا ڈھیر لگ گیا۔ بابا خیرو نے کہیں سے ایک پرانا ترازو نکالا اور ایک ایک پڑیا تولنے لگا ۔ ۳

''کیمیا گر'' میں بانو قدسیہ نے خوابوں کے بیان سے بھی مابعد الطبیعیاتی پہلوؤں کو نمایاں کیاہے۔خواب حیاتِ انسانی کا لازمی جزو ہیناور خواب میں انسان وہی کچھ دیکھتا ہے جو اس کے لاشعور میں جا گزیں ہوتا ہے ۔ اس افسانے میں رشید کے خواب بھی اس کے لاشعوری محرکات کے عکاس ہیں۔ رشید اپنے باپ اور مولوی صاحب کی مار پیٹ سے عاجز آ چکا ہے۔ اس لیے جب وہ بابا خیرو کے متعلق اپنے ہم جماعت فقیرے سے دلچسپ باتیں سنتا ہے تو اس کا دل پڑھائی سے اچاٹ ہو جاتا ہے اور وہ تمام وقت بابا خیرو تک رسائی حاصل کرنے میں صرف کر دیتا ہے۔ دن بھر کی سعیٔ لا حا صل کے بعد جب وہ رات کو سوتا ہے تو خواب میں بھی اسے بابا خیرو کا ہی ہیولا نظر آتا ہے ۔

رات بھر وہ عجیب عجیب خواب دیکھتا رہا۔جیسے مدھم دیا جلا کر وہ غاروں میں پھرتا رہا ہو اور کوئی بڈھا لاٹھی اٹھائے اس کے تعاقب میں بھاگ رہا ہو۔ اس خواب نے کئی صورتیں اختیار کیں لیکن اس خواب کا تانا بانا قائم رہاجو اس کے دل کو گھیرے ہوئے تھا۔۴

ضعیف الاعتقادی اور اوہام پرستی ہمارایک عام معاشرتی روّیہ ہے۔ لوگ توہمات اور اعتقادات کے اسیر نظر آتے ہیں۔ دراصل یہ خوف کا جذبہ ہے جو ان اعتقادات کی بنیاد بنتا ہے کیونکہ لوگ منطقی اور استدلالی بنیادوں پر مسائل کو حل کرنے کی بجائے جذباتی ،تصوراتی اور توہماتی روّیوں سے مسائل کا

حل ڈھونڈتے ہیں۔اس افسانے میں رشید کا کردار بھی ایسی ہی ناپختہ سوچ کا حامل ہے جو اپنے مسائل کا حل بابا خیرو کی باتوں اور جادو ، منتر کے ذریعے تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے ۔

بستہ جھلاتے ہوئے وہ بولا: مجھے ایک عمل آتا ہے اگر چالیس دن پڑھیں تو پھر جس کسی پر پڑھ کر پھونک دیں بھسم ہو جاتا ہے اس کی راکھ تک نہیں ملتی ۔۔۔ مولوی صاحب کی کیا بساط بڑے بڑے اس عمل کے سامنے ٹھہر نہیں سکتے۔ بس بڑھنے کی دیر ہے۔جتنی دیر یہ عمل کرینناں تو ایک سبز چادر باندھ کر کسی کھجور کے پیڑ تلے چلہ کاٹنا پڑتا ہے ۔۵

تحیّر اور اسرار کی یہ فضا بانو قدسیہ کے اکثر افسانوں میں نظر آتی ہے ۔ یہ تحیّر کہیں واقعات کے ذریعے پیدا ہوتا ہے کہیں جذبہ عشق و محبت ، جنس سے اور کہیں کہانی کے عقب میں پوشیدہ اسرار سے پیدا ہوتا ہے ۔ افسانہ ''جھکورا''بھی ایک پُر اسرار افسانہ ہے ۔ اس کی کہانی میں تحیّر و تجسّس کا عنصر بدرجہ اتم موجود ہے۔ '' جھکورا'' ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جو راوی کو ائیر پورٹ سے واپسی پر ایک سڑک کے کنارے ملتا ہے اور اپنی پریشانی بتا کر اس سے لفٹ مانگتا ہے ۔ اس شخص کی غیر معمولی باتیں ، دسمبرکی سرد ، بھیگی رات اور گہرا سناٹاخوف و ڈر کی کیفیات پیدا کر دیتے ہیں ۔

سردی تھی ۔۔۔ بہت سردی تھی۔ خزاں دیدہ پتے گلبرگی درختوں سے اُتر کر سڑک پر ہر جانب ہولے ہولے پانی کی لہروں جیسے آگے بڑھ رہے تھے ۔ کچھ فاصلے پر پٹرول پمپ کی کھڑکیوں کے تمام شیشے دھند آلود تھے ۔۔۔ موسم پر سال سے بچھڑنے کا غم طاری تھا ۔۶

ماورائی عناصر کے ساتھ ساتھ افسانے میں صوفیانہ رنگ بھی موجود ہے۔ پُر اسرار شخص راوی کو بتاتا ہے کہ وہ جب بھی کسی مصیبت سے دوچار ہوتا ہے تو خدا سے مدد مانگتا ہے اور وہی اسے اس مشکل سے نجات دلاتا ہے۔ وہ راوی سے سوال کرتا ہے کہ کیا خدا انسان اور کائنات کے معاملات میں دلچسپی لیتا ہے ؟ لیکن ڈر اور خوف کی بناء پر راوی اس کے کسی سوال کا جواب نہیں دیتا ۔ پُر اسرار شخص کے خیال میں خدا ایک الوہی طاقت کے طور پر ہر وقت اس کے ساتھ موجود ہے۔ اسی لیے اسے مستقبل میں پیش آنے والے بہت سے واقعات کا قبل از وقت پتہ چل جاتا ہے۔ اس پُر اسرار شخص کی گفتگو سے مصنفہ نے ایک طرف اگر تحیّر اور اسرار کی فضا کو پیدا کیا ہے تو دوسری طرف یہی گفتگو افسانے میں ماورائیت کے پہلو کو اُبھارتی ہے ۔

پچھلے سال میرا موٹر سائیکل ایک ٹرک سے ٹکرا گیا ۔موٹر سائیکل پاش پاش ہو گیا ۔لیکن سوائے میرے ماتھے کے اور کوئی خراش نہیں آئی ۔۔۔ یہ بھی کوئی حادثے کی وجہ سے نہیں پڑا۔ حادثے سے بہت پہلے میں جانتا تھا کہ ایک ٹرک جس کا نمبر ۱۳۷۲ ہو گا اور جس کے پیچھے پپو یار تنگ نہ کر لکھا ہو گا اس سے میرا موٹر سائیکل ٹکرائے گا۔ میں حادثے سے بہت پہلے اس کے لیے تیار تھا۔ ۷

''جھکورا'' میں موت کے بیان سے بھی مابعد الطبیعیاتی رنگ پیدا ہوتا ہے ۔ پُر اسرار شخص کے خیال میں اگر کسی کو کوئی حادثہ در پیش ہونا ہو تو موت گھر سے ہی اس کے ساتھ محوِ سفر ہو جاتی ہے اور موت کی ایک مخصوص لذت ہے جس سے ہر کوئی لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔

سنتے تھے کہ اگر کسی کو حا دثہ پیش آتا ہو تو گھر سے ہی موت اس کے ہمرکاب ہو جاتی ہے ۔ اس وقت میرا ارادہ ہوا کہ اسے دھکا دے کر کار سے باہر نکال دوں ۔ لیکن یہ بھی سنا ہے کہ اگر راستے میں وہ موت کے ساتھ اچھا سلوک کرے تو کئی بار موت اسے ساتھ نہیں لے جاتی ۔ آپ کا کیا خیال ہے ؟ کیا موت انسان کی مہربانیوں سے اپنے فیصلے بدل سکتی ہے ۔۔۔ کچھ لوگ صرف ایک بار موت سے ملتے ہیں اور پھر واپس آ کر کسی کو کچھ بتا نہیں سکتے ۔لیکن میں موت سے کئی بار ملا ہوں ۔۸

’’جھکورا میں غیب کا علم جاننا اور اس پر یقین رکھنا مابعد الطبیعیاتی عناصر ہیں جو اس افسانے کے حسن اور معنویت میں اضافہ کرتے ہینکیونکہ پیشن گوئیاں کرنا اور غیب کی باتیں جاننا کوئی عام بات نہیں ۔خدا اپنے مخصوص بندوں کو ہی یہ اذن دیتا ہے کہ وہ آنے والی باتوں کو جان سکیں۔ اس افسانے میں بھی پُر اسرار شخص راوی کے سامنے یہ پیشن گوئی کرتا ہے کہ آج کل کی لڑکیاں انجینئیر سے زیادہ ڈاکٹر کو اہمیت دیتی ہیں۔اس وقت تو راوی اجنبی کی بات کو اہمیت نہیں دیتا لیکن جب گھر واپس آتا ہے تو یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ صوبی جو پچھلے چار سال سے اس کی منگیتر ہے اور اس کی محبت کا دم بھرتی ہے ایک ڈاکٹر کے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے ۔

میں نے صوبی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا ۔ چچا کا گھرانہ اتنا ماڈرن تو تھا کہ اس میں کوئی منصور کسی وقت داخل ہو سکتا تھا لیکن اس قدر گھٹیا نہیں تھا کہ مجھ سے بات توڑے بغیر صوبی کسی منصور کو اپنے بیڈ روم میں آنے دیتی ۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے ہم شادی کر رہے ہیں۔ میرے اندر باہر لکنت جاری ہو گئی دراصل یہ فیصلہ میں نے ابھی کیا ہے ۔ ابھی پانچ منٹ پہلے ۔ ۹

اس پُر اسرار شخص کی ماورائے حقیقت گفتگو اور پُر اسرار واقعات سے راوی خوف زدہ ہو گیا اور یکے بعد دیگرے پیش آنے والے ما فوق الفطرت واقعات نے اسے خوف زدہ کر دیا۔

شیر پاؤپل کچھ ایسا لمبا نہیں ہے لیکن اب مجھے محسوس ہونے لگا کہ اس سڑک پر لگی ہوئی چھوٹی چھوٹی بتیاں ، دونوں جانب بنی ہوئی دیوار لامتناہی تھی ۔ یہ پُل جس قدرپیچھے کی طرف طے ہو جاتا اسی قدر آگے کی طرف بڑھتا۔ شاید پُلوں میں یہ خاصیت ہوتی ہے کہ دن کے وقت یہ جلدی طے ہو جاتے ہیں۔۱۰

اس کے علاوہ کئی اور ماورائے حقیقت واقعات بھی پیش آئے مثلاً جب پُر اسرار شخص سگریٹ سلگانے لگا تو اس کے ہاتھ کے پیالے میں دل کی شکل جیسی روشنی اُبھرتی ہے اور راوی کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ روشنی پوری قوت کے ساتھ پمپ کر رہی ہے۔ راوی نے اس سے بیشتر بکرے کے دل کے سوا کوئی دل نہ دیکھا تھا۔ انسانی ہاتھ میں دل کو دھڑکتے ہوئے دیکھنا ایک غیر فطری بات ہے ۔ ایک اور مافوق الفطرت واقعہ اس وقت پیش آیا جب راوی پُر اسرار شخص کو ائیر پورٹ پر اتار کر گھر واپس آیا تو وہ شخص اس کی کزن کے کمرے میں موجود تھا ۔ اسی شخص نے راوی کو اس کا کھویا ہوا پرس بھی واپس لوٹا دیا۔ پرس کی واپسی اور پُر اسرار شخص کا ائیر پورٹ سے اتنی جلدی واپس آ جانا ماورائے حقیقت واقعات ہیں۔ ’’ جھکورا ‘‘ افسانے کے واقعات کی پُر اسراریت اسے مابعد الطبیعیاتی جہت عطا کرتی ہے ۔ اس کے واقعات پڑھنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ کوئی ایسی ہستی موجود ہے جو تمام امورِ کائنات کو اپنی منشا کے مطابق چلا رہی ہے اور اپنی مخلوق کے تمام

ارادوں پر بھی اس کی گہری نظر ہے ۔ یہ غیبی علم ہے جو خدا اپنے مخصوص بندوں کو عطا کرتا ہے اور یہی واقعات خدا کے ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔ اسی طرح مابعد الطبیعیاتی قسم کے سوالات مثلاً کیا خدا انسان کے ارادوں میں دلچسپی لیتا ہے؟موت کی خوشبو کیسی ہے ؟ کیا خواب کے ذریعے مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کا علم ہو جاتا ہے ؟ اس قسم کے سوالات بھی مابعد الطبیعیاتی جہات کی نشاندہی کرتے ہیں۔

بانو قدسیہ کے افسانوں میں وجود اور کائنات کے مسائل بھی مابعد الطبیعیاتی جہات کو ابھارتے ہیں ۔ ان کے افسانوں میں انسان ، وجود اور کائنات کے حوالے سے مختلف سوالات اٹھائے جاتے ہیں اور پھر ان کے جوابات مذہب ، عقائد اور اساطیر کی روشنی میں ڈھونڈنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ افسانہ '' خود شناس''فرد کی غیریت اور تنہائی کے حوالے سے وجودی مسائل کو سامنے لاتا ہے۔ابراہیم کا کردار ایک ایسے انسان کا کردار ہے جو معاشرے کے آدرشوں سے نباہ نہ کر سکااور بالآخر وہ اپنی سرزمین اور اپنے قیمتی رشتوں کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے ۔ کیونکہ جب انسان آدرشوں سے سمجھوتا نہ کر سکے تو دنیا سے کنارہ کر لینا ہی اس کے حق میں بہتر ہوتا ہے ۔ بانو قدسیہ نے '' خود شناس ''میں ہندی اسطورہ کا استعمال کیا ہے اور اس کا دورِ حاضر کے مسائل پر اطلاق کر کے نئے معانی و مفاہیم پیدا کیے ہیں۔ رانی میناوتی اور اس کے بیٹے راجہ گوپی چند کا حوالہ ہندی اسطورہ کی طرف اشارہ ہے ۔

راجہ گوپی چند جوبھرتری ہری کا بھانجا بتایا جاتا ہے ۔ بھرتری ہری جو راجہ بکر میت کا بڑا بھائی تھا۔ یہ انا کے چکر سے نکلے ہوئے مہاراجے تھے۔ ان میں مہاتما بدھ کی روح گھومتی تھی اور وہ دولت کا کرم بھوگ جو غریبی کے چکر سے بھی سخت ہوتا ہے، توڑ کر اپنے آدرش سے ہم کنارہو گئے تھے ۔ ۱۱

ابراہیم ملکوں کی حویلی کا سپوت تھالیکن اس کی فطرت میں ملکوں کی اجارہ داری اور خاندانی برتری جیسے تصورات نا پید تھے ۔ اس لیے وہ ذات پات ، امیری غریبی اور چھوٹے بڑے کی تقسیم کو غیر اسلامی تصور کرتا ہے لیکن اس کی دادی خاندانی روایات کے گرداب میں اس حد تک جکڑی ہوئی تھیں کہ انھیں لین دین ، خوشی غمی اور میل جول میں خاندانی عزت کے لالے پڑتے رہتے تھے ۔ وہ اپنی خاندانی ساکھ کو سنبھالتے ہوئے بڑھاپے کی منزل سے بھی ثابت قدمی سے گزرنا چاہتی تھیں لیکن ان کے خاندان کا واحد وارث ابراہیم ان ساری روایات سے بیزار تھا ۔ اس کے خیال میں آدرشوں کا غلام انسان خود کبھی کسی آدرش کا حصّہ نہیں بن سکتا ۔ خود شناسی انسانیت کی اوّلین شرط ہے ۔جو خود شناس ہو وہی خدا شناس بھی ہوتا ہے ۔ ابراہیم بھی ان تمام سماجی روّیوں اور جکڑ بندیوں سے خود کو آزاد کرا کر جوگ لے لینا چاہتا تھا۔ نسیم اور اس کے بھائی منظور سے ابراہیم کے تعلقات صرف اس لیے پروان چڑھتے ہیں کیونکہ ابراہیم کے نزدیک کسی کا خاندانی مرتبہ اور دولت کوئی حیثیت نہیں رکھتے ۔ اس لیے وہ ان کے گھر جا کر ان کی مالی مدد کے ساتھ ساتھ اخلاقی مدد بھی کرتا ہے لیکن ابراہیم کی دادی اسے ان تمام باتوں سے منع کرتی ہے کہ اپنے سے کمتر لوگوں سے ملنا ملکوں کی شان

کے خلاف ہے ۔ '' خود شناس '' کا موضوع اگرچہ سوشل سٹیٹس اور کاسٹ سسٹم ہے تاہم اس سے نجات کا راستہ بانو قدسیہ نے وجودیت میں تلاش کیا ہے ۔

جہاں خاکروب کو آپ کی ناپاکی صاف کرنے کے ساتھ ساتھ نفرت کا صلہ بھی ملے ۔ جہاں ستر سالہ تائب طوائف کو پاکیزگی کا بوجھ اور عبادت کی سختی بھی جھیلنا پڑے اور کنجری کی صدائیں بھی اس کے نحیف وجود کو ٹھیلتی رہیں ۔ جہاں بہتّر فرقے با آواز بلند پکاریں کہ مسیح موعود آنے والے ہیں مگر ایک تہتّر واں فرقہ اگر کہہ بیٹھے کہ وہ آ چکے ہیں تو اقلیت --- یہاں میں نہیں رہ سکتا دادی اماں--- میں کسی ایسے ملک میں چلا جاؤں گا جہاں کا نہ معاشرہ امیر ہو گا نہ اس کا قانو ن میں نے تشکیل دیا ہو گا۔ وہاں میں صرف اپنے گناہوں کا جواب دہ رہوں گا۔ ۱۲

افسانے کے آغاز میں غم حسینؓ کی یاد میں امام باڑے سے نکلنے والے جلوس کی آہوں اور سسکیوں کا ذکر کیا گیا ہے ۔ یہ غم در حقیقت انسان کی روح کو روشن کر دینے والا غم ہے ۔ بانو قدسیہ نے یہاں وجودی مسائل کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ بعض اوقات غم انسان کی روح کو صیقل کر دینے کا وسیلہ بنتے ہیں۔ ایسے غم میں آنسو بہانا اس کے لیے نجات کا باعث بنتا ہے پھر یہی غم انسان کو اس کے رب کے قریب کر دیتے ہیں ۔ بالآخر ابراہیم نے بھی ایک غم لے لیا اور جوگ لے کر اپنی خاندانی وجاہت او ر کاسٹ سسٹم سے دور اپنی ذات کے اندر پناہ لینے کا فیصلہ کر لیاکیونکہ اس کے خیال میں جب انسان اپنے آدرشوں کو تحریک کی صورت میں نہ ڈھال سکے تو ایسے میں جوگ لے لینا اس کے حق میں بہتر ہوتا ہے۔ ابراہیم کے انگلینڈ چلے جانے کے بعد لاہور شہر میں زلزلہ آیا جس سے سارا شہر تو سلامت رہامگر ابراہیم کی منتظر نسیم چھت کے ملبے میں ہمیشہ کے لیے دفن ہو گئی اور حویلی کے آنگن میں موجود ابراہیم کے باپ کی قبر میں ایک ایسا شگاف نمودارہوا جس سے آنسو قطروں کی صورت بہتے رہتے ہیں ۔قبر سے آنسوؤں کا گرنا بھی ایک ماورائے حقیقت بات ہے جو کہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ابراہیم نے وہ کام کر دکھایا جو اس کا باپ نہ کر سکا۔ اس افسانے کے متعلق اظہارِخیال کرتے ہوئے عفت افضل کہتی ہیں۔

افسانہ '' خود شناس'' مکمل تصوف پر مبنی ہے۔ اس کا کردار ابراہیم خود کو معا شرے میں اجنبی محسوس کرتا ہے ۔ اس کا خیال ہے کہ اسلام میں امیری ، غریبی اور چھوٹے ، بڑے کے درمیان فرق اور مختلف پابندیوں کا کوئی جواز نہیں لیکن یہ خامیاں ہمارے معاشرے کو مکڑی کے جالے کی طرح جکڑ چکی ہیں اور انسان کتنا بھی چاہے انھیں ختم نہیں کر سکتا ۔۱۳

تصوف کا یہ رجحان بانو قدسیہ کے اکثر افسانوں میں نظر آتا ہے اور اسے انھوں نے اپنے شوہر اشفاق احمد کی روحانیت کے تتبع میں اپنایا۔ افسانہ '' نیلوفر'' میں بھی بانو قدسیہ کے متصوفانہ خیالات کُھل کر سامنے آتے ہیں۔ اس افسانے میں انھوں نے تصوف اور عشق کو باطنی حوالے سے پوری توانائی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ کہانی میں موجود غوث پاک کا قصّہ اور سچے عشق کی تفسیر متصوفانہ خیالات کی وضاحت کرتے ہیں۔ تصوف کا یہ رنگ افسانے میں مابعد الطبیعیاتی جہت کو اُبھارتا ہے ۔ بانو قدسیہ کا یہ افسانہ مختلف رسائل میں '' ننگ وجود '' کے نام سے شائع ہوتا رہا۔ تاہم یہ ان کے افسانوی مجموعے '' باز گشت '' میں '' نیلو فر '' کے نام سے شائع ہوا۔ افسانے کا پلاٹ دوہرا اور گنجلک ہے

۔ ایک طرف نیلو فر کے حسن بے مثال کی داستان بیان ہوئی ہے تو دوسری طرف افسانے میں ایک ضمنی کہانی مزدوروں ، بابو خان ،منشی کی بھی ہے جس میں غوثیہ پاک کا قصّہ بھی شامل کیا گیا ہے۔ اصل قصّہ مقصود اور نیلوفر کے عشقِ لاحاصل کا ہے ۔ نیلوفر کا حسن فتنہ خیز پورے شہر میں مشہور تھااس لیے اس کی شخصیت کے متعلق لوگ طرح طرح کے قصّے از خود گھڑ لیتے تھے تاہم وہ ان تمام باتوں سے بے نیاز اور اپنی ہی دھن میں مگن تھی کیونکہ اس کا دل معصوم اور پاکیزہ تھا لیکن ایک غیر معمولی واقعے نے اسے مقصود کی محبت میں مبتلا کر دیا۔یونہی ایک دن نیلو فر مقصود کے ساتھ اس کے گھر جا رہی تھی کہ راستے میں مزدوروں کا سرغنہ نیلو فر کے حسنِ بے تاب کو دیکھ کر انگشت بدنداں ہو جاتا ہے ۔یہاں وہ غوث پاک کا قصّہ سناتا ہے جس میں ایک سقے کے عشق کی کہانی ہے جو اپنے مرشد سے عشق کی چنگاری حاصل کرنا چاہتا ہے۔

سقہ کے دل کو آگ لگی تھی ۔ آگ۔ پیرو مرشد کے پاؤں پڑ گیاتو وہ بولے میاں سقے تو بُھس اور عشق چنگاری۔ جل جائے گا۔ اب کی لگی آگ تو معمولی ہے۔ پھر ایسا جلے گاایسے جلے گاکہ قبر بھی ٹھنڈی نہ ہو گی تیری ! سقّہ نے عرض کی ۔ آقا! آپ عشق کی آگ بھڑکا دیجئے ۔ میں جلنے سے نہیں ڈرتا۔ یہ تو سلگاہٹ ہے یہ تو جینے نہیں دیتی۔ آقا نے کہابول رے بہشتی عشق مجازی ہو کہ حقیقی؟ مشکیں بھرنے والا بولا۔ حضور کچھ ہی ہو۔۔ہو سہی ۔۱۴

مزدوروں کی ٹولی میں موجود بابو خان اس قصے کو سُن کر نیلو فر کے عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اپنے پیرو مرشد سے عشق کی آگ حا صل کرنے کی درخواست کرتا ہے کہ وہ حسن کی دیوی نیلوفر اگر اسے دس منٹ کے لیے بھی مل جائے تو اسے اس کی زندگی کا حاصل مل جائے گا ۔ مرشد نے اسے سات دن بعد ایک مقررہ جگہ پر جانے کو کہا۔ بابو خان جب وہاں پہنچاتو کوئی موجود نہ تھا۔ دفعتاً وہاں سے غیبی آواز آئی۔

ارے احمق اتنی سی بات بھی نہ سمجھا کہ تجھ میں عشق سہنے کی تاب نہیں ۔ ہم نے بادشاہوں سے محبت کی تو تمام عمر جھاڑ جھونکنے میں گزارا جو انجام ہوا سو تیرے سامنے ہے ۔ اب بھی نہیں سمجھاتو جا۔۔ جل مر۔ ۱۵

اور بالآخر پیرو مرشد کا کہاپورا ہوا۔ بابو خان نے دس منٹ کے لیے نیلوفر کو پا لیالیکن اسی وصال میں وہ جل بھی مرا یوں کہ مقصود نیلوفر کو اوپر اپنے کمرے میں لے گیااور اچانک نیچے حویلی میں آگ لگ گئی۔مقصود کھڑکی سے کود کر نیلوفر کے لیے سیڑھی کا بندوبست کرنے گیا۔ اسی ثانیے میں بابو خان نے نیلو فر کو مقصود کے کمرے میں تنہا دیکھ لیا۔وہ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں تھی ۔نیلوفر کو آگ سے بچانے کی بجائے بابو خان اس کے عشق کی ہوس میں ہی جل کر مر گیا۔

مقصود جب سیڑھی کا بندوبست کر کے اپنے کمرے میں پہنچا تو وہاں دوننگی لاشوں کو جلے ہوئے پایا۔ اسی لمحے مقصود کو ان تمام شکوک و شبہات پر یقین آ گیا جو نیلو فر سے متعلق مشہور تھے ۔ اس افسانے کے متعلق ذکاء الرحمٰن کا خیال ہے کہ

اگرچہ غوث پاک کا قصہ شامل کر کے مصنفہ نے کہانی کا کینوس وسیع کرنا چاہا ہے اور پایاب موضوع کو گہرائی بخشی لیکن بات نہیں بن سکی۔۔ کہانی کے بنیادی عناصر وہی رہے ہیں۔ یعنی جنسی ماحول اور فضا کی سیٹنگ، تصوف کی چاشنی اور میلوڈی انجام ۔ ۱۶

افسانے میں غوث پاک کا قصّہ اور پیرو مرشد کا بیان در حقیقت ہمارے ان اعتقادات کی طرف اشارہ ہے جن کا ہماری روحانی دنیا سے تعلق ہوتا ہے ۔ ایسے مافو ق الفطرت قصّوں سے کہانی میں مابعد الطبیعیاتی رنگ پیدا ہونا لازمی امر ہے ۔ '' نیلو فر'' میں محبت کا الوہی احساس بھی ملتا ہے جو فروغ پا کر سچے عشق کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس کا ذکر مزدوروں کا سرغنہ لال بیگ بابو خان کے سامنے اس طرح کرتا ہے ۔

قصّہ غوثیہ میں مذکور ہے کہ ایک سقّہ پیر و مرشد کے پاس گیا ۔کہنے لگا جناب جی کو لگام نہیں ۔ بکری کی طرح کبھی اس جھاڑی پر منہ مارتا ہے کبھی اس پر۔ برس جناب کی مٹی پر پانی انڈیلا۔ آپ کے قدموں کو ٹھنڈا کیا لیکن میرے دل کی جوالا مکھی ٹھنڈی نہ ہوئی جو کہیں ایک کھونٹے سے بندھ جائے یہ دل تو میں بھی ایک دن آرام کاٹ لوں ۔ گھر گھر ہانڈی میں منہ مارنے سے تو اب دل بھر گیا ہے۔۔۔ عشق کر عشق ۔۔۔ عشق کا تو ایک لمحہ ساری زندگی روشن کر دیتا ہے ۔ ۱۷

افسانے میں مقصود کی ناکام محبت اور بابو خان کے عشقِ لا حاصل کا قصّہ گہری معنویت لیے ہوئے ہے ۔ ایک طرف اگر بابو خان کا عشق سچا تھاتو اسے نیلو فر دس منٹ کے لیے مل گئی لیکن اگر واقعی اس کے عشق میں توانائی موجود تھی تو وہ اپنی محبوبہ کو آگ سے بچانے کی کوشش کرتانہ کہ اسے اورخود کو شعلوں کی نذر کر دیتا ۔ اس افسانے میں پیر و مرشد کے بیان سے بھی مابعد الطبیعیاتی نکتے کی وضاحت ہوتی ہے کہ جب وہ بابو خان کو کہتا ہے جا جل مر اور ایسا ہی ہوا کہ وہ جل کر مر گیا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بعض اوقات انسان کو زندگی میں کوئی ایسا بزرگ مل جاتا ہے جس کا کہا ہوا ایک ایک لفظ سچ ثابت ہوتا ہے ۔ تصوف کا یہ رنگ اور پیر و مرشد کا کردار مابعد الطبیعیاتی جہات کی طرف اشارہ ہے ۔

بانو قدسیہ کے افسانوں میں '' فیبل کہانیاں '' بھی مابعد الطبیعیاتی عناصر کو اُبھارتی ہیں:

فیبل ایک مختصر منظوم یا منشور الیگری ہوتی ہے جس میں انسانوں کے علاوہ حیوانات اور بے جان اشیاء کو بھی انسانی خصائص سے متصف کر کے ان کے گفتار و کردار کے ذریعے انسانوں کے طرزِ عمل پر روشنی ڈالی جاتی ہے اور انسانوں کے لیے کہانی سے کوئی اخلاقی سبق اخذ کیا جاتا ہے۔ ۱۸

افسانہ '' بکری اور چرواہا'' فیبل کہانیوں کے زمرے میں آتا ہے ۔ اس افسانے میں بانو قدسیہ نے بکری کو انسانی اوصاف سے متصف کر کے مالک اور اس کے بندے کے رشتے کو سمجھانے کی کوشش کی ہے ۔ اس افسانے کا مرکزی خیال یہ ہے کہ انسان کا اپنے مالک سے رشتہ اٹوٹ ہوتا ہے ۔ یہ مالک حقیقی بھی ہو سکتا ہے اور مجازی بھی ۔

لمبے سفر سے واپسی پر چرواہا ندی کے پانی سے پاؤں دھوتا۔ چہرے کی گرد اتارتا۔ پھر سنبل کے درخت کے پہلو میں کھونٹے سے بکری کو باندھتا۔ لیکن چرواہے نے آج تک کبھی رسی کی دوہری گانٹھ

نہ لگائی تھی۔بس دونوں کا ایک ان لکھا سمجھوتہ تھا ۔ نہ وہ اسے بلاتا نہ بکری اسے میں مینکر کے مخاطب کرتی۔ کام کاج سے فارغ ہو کر چرواہا بکری کے پاس مونڈھا کر لیتا اور چپ چاپ بیٹھا رہتا ۔ ۱۹

بانو قدسیہ نے اس افسانے میں یہ بات باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ بکری اور چرواہے جیسا رشتہ میاں اور بیوی کے درمیان بھی استوار ہوتا ہے ۔ بیوی کے ہوتے ہوئے شوہر باہر کی ہواؤں میں دم لینے کا خواہش مند رہتا ہے۔ اسے اپنا گھر اور اس کی ہر چیز بے رنگ معلوم ہوتی ہے حتیٰ کہ بیوی کے ہاتھ سے پکے ہوئے پکوان میں بھی اسے کھوٹ نظر آتے ہیں۔ تاہم بیوی کا اپنے شوہر سے رشتہ ہمیشہ خلوص کی چادر سے بندھا رہتا ہے اور وہ اپنے شوہر کی ہر نکتہ چینی اور خطا کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتی ہے اور کبھی حرفِ شکایت زبان تک نہیں آنے دیتی۔ لیکن جب یہی بیوی ایک دن خاموشی سے اس دنیا سے کنارہ کر لیتی ہے تو اس کا شوہر گھر میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتا ہے اور تنہائی کا زہر ہر پل اسے ڈسنے لگتا ہے ۔ اسے باہر کی دنیا اور اس کے ہنگاموں سے کوئی دلچسپی نہیں رہتی کیونکہ اب اسے روکنے اور منع کرنے والا کوئی نہیں رہا ۔

کہتے ہیں کہ جب کوئی ستی ساوتری مر جاتی ہے تو پھر اس کا ستیہ د ان لکڑیاں کاٹنے بن بن نہیں جاتا۔ وہ ستی ساوتری کی روح کو واپس لانے کے لیے یم دُوت کے پیچھے نہیں بھاگتا بس بغیر روح کے ہو کر کھاٹ پر پڑا رہتا ہے اور پھر کبھی جینے کی آرزو نہیں کرتا ۔۔۔ ایسا ستیہ دان ستی ساوتری کے مرتے ہی گرہست آشرم چھوڑ دیتا ہے اور گھر میں رہتا ہوا بھی سنیاس لے لیتا ہے اور اس کے ملنے والے سب آپس میں پوچھتے رہتے ہینکہ آخر ایسا کیوں ہوا۔۔۔ آخر ایسے کیوں ہوتا ہے ۔۲۰

''بکری اور چرواہا'' میں بانو قدسیہ نے بکری کو تمثیل کے طور پر استعمال کیا ہے ۔ بکری جب چرواہے کے ساتھ چراگاہ کی جانب آ رہی ہوتی ہے تو وہ چرواہے کی مرضی کے خلاف کبھی کسی شاخ پر منہ مارتی ہے اور کبھی گھاس پر۔ چرواہا اسے سارے راستے اس عادت سے دور رکھنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ اپنی عادت سے مجبور ہو کر مالک کی مرضی کے خلاف منہ مارتی رہتی ہے ۔ چرواہا جب سستانے لگتا ہے تو اسے ہلکا سا کھونٹی کے ساتھ باندھ دیتا ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ بکری اور چرواہے کا ایک خاص رشتہ ہے لیکن جب ایک دن چرواہا اپنی سستانے والی جگہ پر ہی دم توڑ دیتا ہے تو بکری کھونٹی سے کُھل کر اس کے قریب آ جاتی ہے ۔ حالانکہ اب وہ کھلے بندوں گھوم پھر سکتی ہے اور کسی بھی خواہش کے لیے اپنے مالک کی مرضی کی پابند نہیں لیکن اب وہ کہیں بھی نہیں جاتی ۔

کبھی کبھی وہ اس طرح پہروں بیٹھے رہتے اور کوئی پتہ بھی نہ ہلتا لیکن بکری کے دم کو حوصلہ سا رہتا۔ پھر ایک دن اسی طرح مونڈھے پر بیٹھے بیٹھے پہاڑی سے دور تکتے ہوئے تھکے جسم کو ڈھیلا چھوڑ کر چرواہا اس دنیا سے رخصت ہو گیا ۔۔۔ چرواہا جا چکا تھااور ساری وادی کھلی تھی۔ اُس اُس کرتی پتیوں والی جھاڑیاں ، خوشبو دار گھاس کھٹے میٹھے پھلوں والے بوٹے سب سامنے تھے ۔ پر اب بکری بیٹھی رہی ، بیٹھی رہی اور چرنے چگنے کہیں نہ گئی ۔ اب جو منع کرنے والا ، کھونٹے سے

باندھنے والا ، مونڈھے پر بیٹھا بیٹھا کہیں دور جا نکلا تھا تو بکری کو پاس سے کہیں جانے کی حاجت نہیں رہی ۔۲۱

اس افسانے میں بانو قدسیہ نے بکری اور چرواہے ، میاں اور بیوی کے رشتے کو بیان کر کے در حقیقت انسان اور خدا کے رشتے کو سمجھانے کی کوشش کی ہے ۔ انسان اس دنیا میں آ کر اس کے ہنگاموں اور رنگینیوں میں اس حد تک کھو جاتا ہے کہ وہ اپنے خالق کی یاد سے ہی غافل ہوجاتا ہے لیکن جونہی وہ کسی تکلیف سے دوچار ہوتا ہے یا دنیاوی رشتے اُسے تنہا چھوڑ دیتے ہیں تو وہ فوراً اپنے مالک کی یاد میں سرگرداں ہو جاتا ہے کیونکہ بالآخر اسے خدا کی یاد میں ہی پناہ اور سکون ملتا ہے ۔ یہی نکتہ اس افسانے کو صوفیانہ رنگ عطا کرتا ہے۔ خدا کی یاد اور اس کی محبت انسان کو ہر قسم کے دنیاوی علائق سے آزاد کر دیتی ہے اور وہ زندگی کی دلچسپیوں سے دور ہو کر خدا کی ذات میں خود کو گم کر دیتا ہے ۔

بانو قدسیہ کے افسانوں میں کائنات اور انسانی وجود کی اصل حقیقت کے متعلق بے شمار مابعد الطبیعیاتی سوالات اُبھرتے ہیں اور پھر شدید جذباتیت میں مدغم ہو جاتے ہیں۔ یہ سب کیا ہے ؟ کیوں اللہ کے نیک بندے روز غم کھاتے ہیں؟اس کائنات میں انسان کے وجود کی اہمیت کیا ہے ؟ اور اس نوعیت کے دیگر کئی سوالات بانو قدسیہ کے افسانوں میں اُبھرتے ہیں ۔ افسانہ ''مراجعت ''اس نوع کے وجودی مسائل سے لبریز افسانہ ہے۔ اس افسانے کا موضوع اگرچہ خدا کے وجود کا اقرار ہے مگر اس موضوع کی وضاحت کے دوران بانو قدسیہ نے روحانی اور متصوفانہ خیالات کی وضاحت کی ہے ۔ مصنفہ نے کہانی میں خدا تک پہنچنے کی داستان بیان کی ہے جو بالآخر انسانی روح کے لیے باعثِ تسکین ہو جاتا ہے ۔ زاہد اقبال اپنی ماں کا واحد سہارا ہے جسے اس کی ماں نے بیوگی کی سفید چادر اوڑھ کر پالا ہے لیکن شہر سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد زاہد اقبال کا ذہن منتشر ہو کر رہ گیا ہے اس لیے وہ ہر وقت اس کائنات اور خدا کے وجود سے متعلق شک و شبہات کا اظہار کرتا رہتا ہے ۔

کس کی یاد ماں؟ --- اللہ کی؟ ---کون ہے اللہ ؟ --- بتا ؟ --- کس کو یاد کرتے مر جاتے ہینغریب؟ارے تیرے اللہ نے تو پھر پیغمبروں کی نہ سنی ، وہ معمولی آدمی کی کب سنتا ہے ! مت میرے سامنے نام لیا کر اس بڈھے کھوسٹ کاجو بنا بنا کر پھینکتا جاتا ہے ۔ انسان کو دنیا پر---اور پھر نہیں پوچھتاکسی ایک کو بھی --- کتنا غم کھاتے ہیں روز اللہ کے بندے--- اتنا غم تیرے اللہ کو کھانا پڑے تو وہ چھوٹے سے ذرے برابر ہو جائے گھس گھس کر۔ ۲۲

زاہد اقبال نے مشنری کالج میں تعلیم حاصل کی ہوتی ہے جہاں اسلامی عقائد اور افکار پر بالکل بھی توجہ نہیں دی جاتی اس لیے وہ لادینی ذہنیت کا مالک ہے اور شہر سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے باوجود خدا کے وجود سے منکر ہے ۔ وہ کئی بار اپنی ماں کو خود کشی کا الٹی میٹم دے چکا ہے ۔ اسی دوران اس کی ملاقات پروفیسر اعجاز سے ہوتی ہے جو بیالوجی کے استاد ہیں ۔ پروفیسر اعجاز بھی مذہب سے دور اور بھٹکے ہوئے ذہن کے مالک ہیں ۔ اس لیے وہ اتنی خوشحال زندگی گزارنے کے باوجود اپنی تقدیر کے شاکی ہیں۔ مصنفہ نے کہانی میں پروفیسر اعجاز کی گفتگو سے فلسفۂ وجودیت کی وضاحت کی ہے جو افسانے میں ما بعد الطبیعیاتی رنگ پیدا کرتی ہے ۔

میں اس زندگی کا بوجھ ایک لمحہ بھر نہیں اُٹھا سکتا جو مجھ سے میری آزادی چھینتی ہے جو چکی میں صبح شام پیستی ہے --- میں تو ایسے خدا کو بھی نہیں مانتا جو باندھ کر زندہ رکھنا چاہتا ہے انسان کو --- میں پروفیسر اعجاز باسط بہ قائم ہوش و حواس کہتا ہوں کہ خدا نہیں ہے ۔ اس کا اگر وجود ہوتااور ہم سب اس کی مخلوق ہوتے تو اسے کسی لمحے کسی گھڑی ہم پر ترس ضرور آتا۔۲۳

پروفیسر اعجاز اپنی زندگی سے بیزار ہو چکا ہے اس لیے وہ ایک دن خود کشی کا ارادہ کرتا ہے لیکن اسے زاہد اقبال بچا لیتا ہے۔ پھر یہی پروفیسر اعجاز زاہد کو شکر ادا کرنا سکھاتا ہے اور اسے اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ ماں کے کیا کیا حقوق اس پر واجب ہیں ۔ انسان ہونے کے ناطے ہماری ذمہ داریاں کتنی اہم ہیں ۔ انسانی فطرت ہے کہ وہ لیتے وقت حریص اور دیتے وقت لالچی بن جاتا ہے۔

پروفیسر اعجاز کی ان باتوں نے زاہد اقبال کے ضمیر کو بری طرح جھنجھوڑا ڈالا۔ اس کے بعد اس نے کبھی خود کشی کا الٹی میٹم نہ دیاکیونکہ پروفیسر اعجاز نے اسے ایسا مفروضہ سمجھایاجس پر یقین کر کے وہ اپنی پوری زندگی گزار سکتا تھا۔

کیا تم ایک ایسا مفروضہ اپنی روح کے آرام ، اپنی سائیکی کی بقا ، اپنے شعور کی جلا کے لیے پال نہیں سکتے جس کا آرام کلی طور پر تمہاری ذات کو ہو گا؟ ---آج سے اس مفروضے پر زندگی بسر کرو کہ خدا ہے ۔ تمہارے لیے اس سے زیادہ اور کسی مفروضے کی ضرورت نہ ہو گی۔۲۴

بحیثیت مجموعی بانو قدسیہ کے افسانوں میں موجود ماورائی ، متصوفانہ اور رومانی عناصر مابعد الطبیعیاتی فکر کو ابھارتے ہیں ۔ جس کی وجہ سے ان کے ہاں موضوعات کی نئی نئی جہتیں ابھرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں ۔ یوں وہ ایک حقیقت پسند افسانہ نگار ہوتے ہوئے بھی تخیلاتی اور تصوراتی زندگی کو بیان کر جاتی ہیں ۔

حوالہ جات:

)۱(محمد عالم خان ، ڈاکٹر، اردو افسانے میں رومانی رجحانات، لاہور: علم و عرفان پبلشرز، ۱۹۸۸ء ، ص ۵۱۱

)۲(بانو قدسیہ ، ناقابلِ ذکر ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۵ء، ص ۱۷۹

)۳(ایضاً ، ص ۱۷۶

)۴(ایضاً ، ص ۱۷۷

)۵(ایضاً ، ص ۱۷۸

)۶(ایضاً ، ص ۲۰۹

)۷(ایضاً ، ص۲۱۱

)۸(ایضاً ، ص ۲۱۲

)۹(ایضاً ، ص ۲۱۹

)۱۰(ایضاً ، ص ۲۱۲

)۱۱(بانو قدسیہ، آتش زیرِ پا، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز ، ۲۰۰۰ء ،ص ۸۹
)۱۲(ایضاً ، ص ۱۰۷
)۱۳(عفت افضل ، بانو قدسیہ : شخصیت اور فن، حیدرآباد: ادارہ انشا ، ۲۰۰۳ء، ص ۱۱۷
)۱۴(بانو قدسیہ ، بازگشت، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز ، ۱۹۹۳ء ،ص ۵۳۵
)۱۵(ایضاً ، ص ۵۴۲
)۱۶(ذکا ء الرحمٰن ، ''ننگِ وجود پر تبصرہ ''، مشمولہ بانو قدسیہ شخصیت اور فن ، عفت افضل ، حیدرآباد: ادارہ انشاء ، ۲۰۰۳ء، ص ۱۱۷
)۱۷(بانو قدسیہ ، توجہ کی طالب ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ، ۱۹۸۵ء ، ص ۵۳۴
)۱۸(ابو الاعجاز حفیظ صدیقی ، کشاف تنقیدی اصطلاحات ، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان،۱۹۸۵ء، ص ۱۳۹
)۱۹(بانو قدسیہ ، کچھ اور نہیں ، لاہور: مکتبہ اردو، ۱۹۷۶ء ، ص ۱۴۸
)۲۰(ایضاً ، ص ۱۴۹
)۲۱(ایضاً ، ص ۱۴۸
)۲۲(بانو قدسیہ، توجہ کی طالب ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۵ء ، ص۷۵۲
)۲۳(ایضاً ، ص ۲۱۴
)۲۴(بانو قدسیہ، توجہ کی طالب ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۵ء ، ص ۷۶۴

کتابیات:

* ابو الاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات ، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء
* بانو قدسیہ ، آتش زیرِ پا ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز ، ۲۰۰۰ء
* بانو قدسیہ ، بازگشت، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز ،۱۹۹۳ء
* بانو قدسیہ ، توجہ کی طالب ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ، ۱۹۸۵ء
* بانو قدسیہ ، کچھ اور نہیں ، لاہور: مکتبہ اردو ،۱۹۷۶ء
* بانو قدسیہ ، ناقابلِ ذکر ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز ، ۱۹۸۵ء
* ذکاء الرحمٰن ، ''ننگِ وجود پر تبصرہ''، مشمولہ: بانو قدسیہ شخصیت اور فن، عفت افضل، حیدرآباد: ادارہ انشاء ، ۲۰۰۳ء
* عفت افضل ، بانو قدسیہ : شخصیت اور فن، حیدر آباد : ادارہ انشا ، ۲۰۰۳ء
* محمد عالم خان ، ڈاکٹر ، اردو افسانے میں رومانی رجحانات ، لاہور : علم و عرفان پبلشرز ، ۱۹۸۸ء

/...../